انتخاب

سُنّی اور شیعہ مکاتبِ فکر

——— میں تعاون کی ضرورت

محترمی و مکرّمی جناب مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

السّلامُ علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ!

ماہنامہ "رسالۃ الاسلام" دنیائے عرب میں بالخصوص عراق میں اسلامی افکار کے فروغ، اسلامی سیاست کے رجحانات کی تقویت اور اسلامی شعور کی بیداری میں بہت بڑا کردار ادا کر رہا ہے۔ جس حد تک وسائل و حالات اسے موقع دیتے ہیں اور جس حد تک کٹھن پابندیاں جن کے اندر ہم جی رہے ہیں، اسے اجازت دیتے ہیں، یہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔

اس مجلّے کے سرپرست اور نگران اور خود وہ ادارہ جس کی طرف سے یہ پرچہ نکلتا ہے اور اس ادارے کی پشت پناہی کرنے والی تنظیمیں جو تمام علمی اور تعلیمی اور اجتماعی میدانوں میں کام کر رہی ہیں، یہ تمام اثنا عشری گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر جہاں تک دعوتِ اسلامی کا معاملہ ہے، تمام شیعہ کارکن اپنے آپ کو ذمہ داری کی اس سطح پر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن کا لحاظ موجودہ دَور میں ملّی قیادت کے لیے ناگزیر ہے۔

شیعہ کارکن اپنی سرگرمیوں پر مخصوص گروہی رنگ چڑھانے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ چنانچہ ان کے تعلیمی اداروں میں شیعہ اساتذہ اور سُنّی اساتذہ پہلو بہ پہلو کام کرتے ہیں۔ ان کے جدید لٹریچر میں، اور بہت سی قدیم کتابوں میں اثنا عشری نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ سُنّی فرقوں کی آراء بھی پیش کی جاتی ہیں۔ ان کے پرچے بلالحاظ مذہب ہر مسلمان فکری کاوش کے لیے کھلے ہیں۔ ان کے اس طرزِ عمل کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مسلمان قیادت اس وقت تک کسی بھی نظریہ کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکتی۔ جب تک وہ اپنی دعوت کو مخصوص گروہ تک محصور رکھے گی

اور اپنے اختلافی پہلوؤں کے ساتھ چمٹی رہے گی۔ نیز ان کا یہ بھی عقیدہ ہے۔ کہ نزاعی مسائل میں دوسرے فریقوں کے خیالات سمجھے بغیر اور ان کے عذرات کا پاس کیے بغیر گروہی تقسیم میں مبتلا ہونا اور اندھا دھند مذہبی کش مکش برپا کرنا مسلمانوں کی کمزوری کا سب سے بڑا عامل ہے۔ دشمنانِ اسلام نے ہمیشہ مسلمانوں کے اندر اس عامل کو زیادہ سے زیادہ ہوا دی ہے اور استعماری طاقتوں نے بھی اپنے تمام ہتھکنڈوں سے اس کی جڑوں کو گہرا کرنے کی کوشش کی ہے۔

مسلمانوں کا مذہبی اختلاف دراصل اس اجتہادی نظام کا طبعی نتیجہ ہے۔ جس پر تمام فرقے کاربند ہیں، اور جو فقہی اصولوں میں بھی جاری وساری ہے، اور فروع میں بھی۔ اور اگر شیعہ سنی اختلاف موجودہ حالات میں صرف فقہی پہلو تک محدود رکھا جائے اور عملی زندگی میں اسے دَر آنے کا موقع نہ دیا جائے، تو بات بہت آسان ہو جاتی ہے۔

اس لیے کہ سنی مذاہب اور شیعہ مذہب کے اندر جتنا کچھ اختلاف موجود ہے، اتنا اختلاف خود اہل سنت کے چاروں مذاہب کے اندر بھی موجود ہے، اور علمی طور پر یہ بات ثابت شدہ ہے کہ شیعہ مذہب کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کی نظیر دوسرے اسلامی مذاہب کے اندر نہ پائی جاتی ہو، مزید برآں یہ کہ خود اہل سنت میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے: جو امام جعفر بن محمد صادق کے اجتہادی مرتبہ و مقام اور ان کی فقہی قدر و منزلت میں اختلاف رکھتا ہو۔ خواہ ان کی امامت اور عصمت کے باب میں اسے اختلاف ہی ہو۔ گویا فقہ میں انہوں نے جن آراء کا اظہار کیا ہے۔ وہ سارے مسلمانوں کے ہاں قابل قبول ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں فقہی مسائل کے بارے میں بہت سی مشترک قدریں ہیں۔ اس بناء پر ہماری رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر باہم اتحاد شرعی فریضہ ہے۔ مسلمانوں کے موجودہ حالات اس کے متقاضی ہیں اور ملت کی صفوں کو متحد کرنے اور تمام مساعی کو اسلام کی سربلندی پر مرتکز کرنے کے لیے مسلمانوں کی موجودہ ذمہ داریوں کا تقاضا بھی یہی ہے۔

اس لیے یہ رسالہ ہمیشہ علمائے اسلام کے اندر نظریاتی تعاون کی دعوت دیتا رہتا ہے، تاکہ وہ ایک دوسرے کی آراء کو سمجھیں، ایک دوسرے کے دلائل اور مسالک سے آگاہ ہوں، اور اسی بنیاد پر وہ ایک دوسرے کو اپنے اپنے مسلک کا الاؤنس دیں۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے وہ فکری مقاطعہ ختم ہو سکتا ہے جو پچھلے عرصہ سے دونوں گروہوں کے درمیان چلا آرہا ہے۔ یہ مقاطعہ دراصل بعض مخصوص ہنگامی عوامل کی بناء پر پیدا ہو گیا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں وہ المیہ ظہور پذیر ہوا، جسے مسلمانوں نے اپنے پورے تاریخی دور میں بھگتا ہے۔ بلکہ یہ مقاطعہ ہی اس المیے کو طول دینے کا موجب رہا ہے۔ اب مفاہمت کا یہ جذبہ ہی اسلام کے اصل اور اہم مسئلہ تعاون و یک جہتی

کے نئے دور کا آغاز کر سکتا ہے۔ اس اصل اور اہم مسئلہ سے ہماری مراد اسلامی ریاست کا قیام ہے۔ اس مقصود کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجلہ "رسالۃ الاسلام" نے اپنے دروازے بلاد اسلامیہ کے تمام اہل فکر حضرات کے نتائج فکر کے لیے پورے اخلاص و صدق دلی کے ساتھ کھول رکھے ہیں۔

"عدنان البکاء"

(ماخوذ از ہفت روزہ "ایشیا" لاہور، یہ اقتباس ہے اس خط کا ہے، جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نام ایک شیعہ عالم عدنان البکاء نے لکھا ہے۔ عدنان البکاء ماہنامہ رسالۃ الاسلام" بغداد کے چیف ایڈیٹر اور بغداد الہیات کالج کے وائس پرنسپل ہیں۔")

"فکر اسلامی کی اساس اور اس کی تشکیل جدید کا مسئلہ"

۱۸ مئی کو پروفیسر ایس، وحید الدین نے اپنا عالمانہ مقالہ پڑھا۔ عنوان تھا، "فکر اسلامی کی اساس اور اس کی تشکیل جدید کا مسئلہ"۔ اسلام اُن دیکھے خدا کی طرف دعوت دیتا ہے، جو اوّل اور آخر ہے، جو تجربے اور ادراک سے ماورا ہے، لیکن اس نظریۂ توحید کا ایک تجربی پہلو ہے جو تاریخ میں ظہور پذیر ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ توحید کا خالص دینی پہلو دنیا کے تجربی پہلو سے کسی طرح الگ نہیں کیا جا سکتا، اس کی ابتدا نفی سے ہوتی ہے۔ پھر اثبات کی طرف لے جاتا ہے، اور اس کے بعد پوری قوت سے تاریخ کے عمل کے ساتھ ساتھ اس کے تہ در تہ مضمرات کھلتے رہتے ہیں۔ اگر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے تو اقبال کے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام سے ہر لمحہ ایک تازہ جہاں کی نمود ہونی چاہیئے، اور یہی مطلب ہے قرآن مجید کی اس آیت "کل یوم ھو فی شان" کا دین اسلام کا یہی وہ متحرک پہلو ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ کے کسی لمحہ میں یا کسی موڑ پر اس عقیدہ کے سارے امکانات ختم نہیں ہو سکتے۔ اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف قوموں نے اسے قبول کر کے اس کے ارتقاء کی نئی راہیں پیدا کیں، اس صورت حال کو اگر مان لیا جائے تو اسلام کی تشکیل جدید کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور یہ حل کوئی ایسی بدعت نہ ہوگی جسے قبول کرنے میں دشواری ہو۔

(ماخوذ از رسالہ "جامعہ" دہلی)

اسلام میں قانون سازی کا حق کسے حاصل ہے

اسلام کا ایک معاشرتی و اخلاقی تحریک کی حیثیت میں، جس کی کہ بنیاد ایک ہمہ گیر اور جامع عقیدے پر تھی، ساتویں صدی عیسوی کے نصف اول میں سرزمین حجاز میں آغاز ہوا۔ قرآن مجید کی ابتدائی نازل شدہ آیات اس عقیدے کی بنیادی خصوصیت کو بڑی اچھی طرح واضح کرتی ہیں، یہ عقیدہ جامع ہے ایک خدا کے مثالی تصور اور اس کے ساتھ ساتھ خاص طور پر ایک انسانیت کے تصور پر۔ اسلام زندگی کے کسی خاص شعبے کے نظام کا نام نہیں بلکہ وہ عبارت ہے مجموعی زندگی کے بارے میں ایک پورے رویّے سے۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ اسلام نام ہے زندگی کے بارے میں ایک پورے رویّے کا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کیفیات و تجربات جو ایک فرد کے باطن میں ذاتِ باری تعالیٰ کی نسبت واقع ہوتے ہیں، نیز وہ تعلقات جو فرد اور باری تعالیٰ کے مابین پائے جاتے ہیں اور جنہیں آج کل کی اصطلاح میں "خالص مذہبی" کہا جاتا ہے، اسلام صرف ان کا نام نہیں، بلکہ وہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اس لیے "اسلامی معاشرہ"، "اسلامی اقتصادیات" اور "اسلامی حکومت" کے تصورات نہ صرف یہ کہ اپنی جگہ معقول ہیں، بلکہ وہ اسلام کے عمومی تصور کے لازمی اور منطقی اجزاء ہیں۔

ایک خدا کے مثالی تصور اور اس کے ساتھ ساتھ خاص طور پر ایک انسانیت کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قرآن مجید نے کئی شعائر اور تدابیر کی نشان دہی کی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شروع ہی میں معاشرتی و اقتصادی انصاف کے اصول جو سب مومنوں کے لیے ایک سے مواقع کی راہ کھولتے ہیں، اسلام کی اصل روح میں داخل تھے۔ نماز، زکوٰۃ روزے اور بیت اللہ کے حج کے عظیم شعائر صاف طور پر اس غرض سے فرض کیے گئے کہ وہ جہاں فرد اور باری تعالیٰ کے درمیان ایک روحانی ربط فراہم کرتے ہیں، اور ایک مذہب کی بنیادی رُوح یہی ہے، وہاں وہ ایک اخلاقی قانون کے ماتحت مربوط انسانی اخوت و مساوات کا عملی ذریعہ بنیں۔ جب ان شعائر کو شروع میں عملی جامہ پہنایا گیا، تو آگے چل کر ان اساس پر انتظامی و معاشرتی ادارے بنے۔

اسلام کی اس جامعیت اور اس کے مجموعی زندگی کے پورے رویے پر مشتمل ہونے سے اس کا "عبادت" کا بنیادی اور ہمہ گیر تصور منتج ہوتا ہے۔ اسلام نے "عبادت" سے نہ صرف WORSHIP یعنی ان کے منجملہ شعائر میں ہونے کا مفہوم لیا بلکہ اس کے انتہائی وسیع معنوں میں اس سے مراد خدمت (SERVICE) لی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید بے جان کائنات کے غیر اختیاری رویے کو بھی واضح طور پر "عبادت" قرار دیتا ہے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اسلام نے شعائری عبادت کو "ترکِ دُنیا" کے تصور کے ساتھ خلط

ہونے سے محفوظ رکھا اور شعاری عبادت کے معنی یہ قرار دیئے کہ انسان پورے خشوع و خضوع اور خلوص و ادراک کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی خدمت بجا لانے کے لیے قوت و خلوص طلب کرے۔ اسی بناء پر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام محض چند مراسم یا مذہبی احکام کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام چونکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، اس لیے اسلام نام ہے اس طرز زندگی کا جو کم و بیش مسلمانوں میں عہد گزشتہ میں رہی ہے۔ اور اب اگر اس طرز زندگی میں کوئی اختلال واقع ہوتا ہے تو یہ مرادف ہے اسلام اور اس کی طرز زندگی کی قدروں کو درہم برہم کے

اسلام کا اوّلین مقصد انسانی زندگی کو انفرادی اور اجتماعی ہر دو لحاظ سے صالح اور اخلاقاً فعال بنانا ہے حکومت کا قیام اسلام کا اوّلین مقصد نہیں، لیکن چونکہ انسانی معاشرے کی تنظیم کے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا، اس لیے اسلام کے نزدیک ایسے اداروں کا وجود ضروری ہو جاتا ہے، جو خدائی قانون کو اپنائیں۔ اس کی ترجمانی کریں اور اسے عملی شکل دیں۔ اس خدائی قانون کا نام شریعت ہے۔ قرآن مجید جو وحی خداوندی کا حاصل ہے، گو زیادہ اور بالذات اخلاقی اور روحانی اصولوں کی کتاب ہے، لیکن اس میں جا بجا تاریخی مواقع کے ضمن میں ان اصولوں کی قانونی ترجمانی بھی کی گئی ہے۔ قرآن کے ساتھ ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شریعت خداوندی کے اصولوں کی شرعی حیثیت سے ترجمانی فرمائی، جس کا مجموعہ سنت نبوی ہے۔ اخلاقی اور روحانی اصولوں کی قانونی ترجمانی اور اس کی بنیاد پر قانون سازی کا کام نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ نے جاری رکھا، بلکہ اسلامی تاریخ کی پہلی تین صدیوں میں اس نہج پر برابر کام ہوتا رہا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے فرد انسانی اصلاً اور بنیادی طور پر ایک آزاد شخصیت رکھتا ہے لیکن معاشرے کا ایک جزو ہونے کی بنا پر اس پر روحانی اور معاشرتی جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان کے پیش نظر اسے فرائض کا حامل قرار دیا گیا ہے۔ ان کو "حدود اللہ" کہا گیا ہے۔ یہ "حدود" بنیادی انسانی حریت کو سلب کرنے کے لیے نہیں ہیں، بلکہ ان کا مقصد روحانی اور اخلاقی اقدار کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہیں ذریعہ بنانا ہے۔

رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام جہاں ہادی و مزکی تھے، وہاں وہ بیک وقت حکمران بھی تھے اور قانون ساز بھی۔ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد گو حکمرانی کے اختیارات خلفائے راشدین کے ہاتھ میں رہے، لیکن قانون سازی کا اختیار کسی ایک شخص کے پاس نہ تھا۔ اس ضمن میں جو بھی قدم اٹھایا جاتا، صحابہ کے مشورے سے جو امت کے قائدین تھے، اٹھایا جاتا تھا۔ گویا دوسرے معنوں میں امت بحیث المجموع قانون سازی کرتی تھی۔

قانون سازی کو من حیث المجموع اُمّت کا حق قرار دے کر حکمرانی کو جو اس طرح مشروط کیا گیا تو اسے ہم بجا طور پر "دستوریت" کا نام دے سکتے ہیں۔ گو اس وقت کوئی تحریری دستور نہ تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی تاریخ میں مشروط اور دستوری حکومت کا آغاز اسلامی حکومت سے ہوتا ہے۔

خلفائے راشدین کے دور میں اس طرح جو اسلامی دستور وجود میں آیا، اس کی بنیاد قرآن حکیم اور رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت تھی۔ اب ظاہر ہے ہر عہد میں قرآن اور سنت کی ترجمانی کی ضرورت ہے۔ اور یہ اجماع ہے جو اس ترجمانی کا معتبر حامل رہا ہے۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حکمرانوں کے پاس قانون سازی کے اختیارات نہ تھے قانون سازی امت من حیث المجموع کرتی تھی۔ البتہ حکمران اس کا نفاذ عمل میں لاتے تھے۔

اسلام میں اجماع کو قانون سازی کے جو اختیارات حاصل تھے، وہ مسیحی کلیسا یا ہندو برہمنوں کی طرح کسی خاص مذہبی گروہ یا مذہبی رہنماؤں کی کسی خاص کونسل کے لیے مخصوص نہ تھے۔ اس ضمن میں فقہاء کا کام صرف یہ تھا کہ وہ قانون سازی کے اس عمل میں انفرادی قیادت کے فرائض ادا کریں۔

جیسا کہ خلافتِ راشدہ کے ضمن میں اوپر ذکر ہوا، اسلامی حکومت جمہوری حکومت کی ایک شکل ہے اور اسلامی حکومت کی جمہوریت کا ضامن اجماع ہے۔ بدقسمتی سے ہوا یہ کہ ہمارے فقہاء اور علماء نے ایک وقت تک جو اجماع وقوع پذیر ہو چکا تھا، اسے حتمی اور آخری قرار دے دیا اور اس کے بعد اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔

اس وقت مسلمانوں کے اولیں فرائض میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن مجید کے علاوہ احادیث کے ضخیم ذخیرے میں سے سنت نبوی کے استخراج کی کوشش کریں۔ اور ان میں سے علماء کا ایک گروہ آگے آئے جو قرآن مجید اور سنت نبوی کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ موجودہ دنیا کے مسائل اور موجودہ قانون کو جانتا ہو۔

اس کام کے لیے چند ایک نسلیں درکار ہیں اور جب تک کہ ایک ایسا گروہ بتدریج ظہور میں نہیں آتا جو قرآن مجید اور سنت نبوی کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ موجودہ دنیا کے مسائل اور موجودہ قانون کو جانتا ہو، موجودہ علماء اور موجودہ جدت پسندوں میں باہمی بحث وجدال ناگزیر ہے اور ہمارے نزدیک اسے روا نا غلطی ہوگی۔

ماخوذ از ہفت روزہ "آوازِ پختون" کراچی
تحریر کردہ۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی

ادارہ تحقیقات اسلامی پوری امت کے جس میں اس کا ہر ہر فرقہ شامل ہے، روحانی، دینیاتی، علمی، اجتماعی، فقہی، تاریخی اور اخلاقی ورثے کے کسی حصے کا انکار نہیں کرتا البتہ اس پر اس کا اصرار ہے کہ اس ورثے کی آج کے تاریخی تنقیدی معیاروں پر جانچ پڑتال ہو۔ اور اس سے وہ سب کچھ استنباط کیا جائے، جس سے امت کے دلوں کو ایمان و یقین اور دماغوں کو جلا ملے۔ اور ہم میں حرکت و اقدام کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہوں۔

ہر قوم کی اصل قوت اس کا وہ معنوی وجود ہوتا ہے، جسے تاریخ صدیوں کے ارتقاء کے دوران ترتیب دیتی ہے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی امت اسلامیہ کے اس معنوی وجود کو نئی زندگی دینا چاہتا ہے تاکہ وہ آج کے زمانے کے حقائق کو سمجھ سکے اور انہیں پرکھے۔ ان میں سے جو اس کے مزاج کے مطابق ہوں، ان کو اپنائے اور باقیوں کو رد کر دے۔

زندگی میں موجود حقائق سے کسی نہ کسی حد تک توافق و تطابق کرنا ہی پڑتا ہے لیکن ایک توافق و تطابق ہوتا ہے منفیانہ۔ اور دوسرے کا طریقہ مثبت ہوتا ہے۔ اگر امت اسلامیہ کا معنوی وجود بحال ہو جائے۔ تو وہ مغرب کی سائنس، ٹیکنالوجی، ثقافت عمومی اور علمی و ادبی و اجتماعی زندگی سے جو استفادہ کرے گی، یا اسے اپنائے گی تو مثبت طریقے سے اپنائے گی جیسے کہ تاریخ اسلام کی شروع کی صدیوں میں مسلمانوں نے یونانی علوم، ایرانی ادب و حکمت اور ہندی افکار سے استفادہ کیا تھا، اور ایک حد تک انہیں اپنایا تھا۔

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کی یہ کوشش ہے کہ وہ امت کے تاریخی ورثے کی باقیات صالحات کو پہ سے اہل علم و فکر کے سامنے پیش کرے تاکہ امت کو دوبارہ اپنا معنوی وجود ملے جس کی بدولت وہ اس قابل ہو سکے کہ آج جس زبردست سیلاب کا اسے سامنا کرنا پڑ رہا ہے نہ صرف یہ کہ اس میں اس کے پاؤں نہ اکھڑیں، وہ تہ آب ہو جائے، بلکہ وہ مردانہ وار اس سیلاب میں آگے بڑھے۔ اور ساحل مراد تک پہنچے۔

یہ تجدد ہے یا قدامت، ادارہ تحقیقات اسلامی کے سامنے یہ مقصد ہے اور جہاں تک اس سے بن پڑتا ہے، وہ اسے خیال سے عمل میں لانے کے لیے کوشاں ہے۔